بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ابھی پوری ملتِ اسلامیہ اہلِ افغانستان کی عظیم مصیبت پر پریشان و مضطرب تھی جو تین سال سے سُرخ سامراج کی خوفناک جارحیت سے ٹکرا رہے ہیں کہ ادھر دوسری طرف امریکہ کی پشت پناہی سے اسرائیل نے لبنان میں پناہ گزین فلسطینیوں کو ایسی بہیمیت کا نشانہ بنایا کہ جس کی کوئی مثال دُور دُور تک نہیں ملتی[1]۔ دونوں طرف تمام بین الاقوامی ضابطے اور سمجھوتے پامال ہو گئے، مسلّمہ انسانی حقوق غارت ہو گئے، مگر جدید تہذیب کی بنائی ہوئی دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو ظالم کے مقابلے پر مظلوم کی حمایت کے لیے عملاً کچھ کر سکے۔ حتیٰ کہ ادارۂ اقوام متحدہ بھی سوائے اس کے کچھ حیثیت نہیں رکھتا کہ یہ سپر پاورز کا ایک تھیٹر ہے جس میں وہ پُراسرار ڈرامے پیش کرتے ہیں ـــــ کبھی ایک ہیرو اور دوسرا ولن بنتا ہے اور کبھی دوسرا ہیرو اور پہلا ولن بنتا ہے۔ فلموں اور تھیٹر کے کردار پستول سے لیس ہوتے ہیں، مگر اقوام متحدہ کے ایکٹر "ویٹو پاور" سے مسلح ہیں۔ ایک کوئی طلسم بناتا ہے، دوسرا ویٹو کر دیتا ہے ـــ دوسرا کوئی منصوبہ لے کے اُٹھتا ہے تو پہلا ویٹو کر دیتا ہے۔ دونوں نے ویٹو پاور کا جو استعمال پچھلے دس پندرہ سال سے کیا ہے، اگر اس کا تفصیلی جائزہ

---

[1] لبنان میں ابتدائی چند دنوں ہی میں ۵ ہزار فلسطینی اور لبنانی مسلمان شہید ہو گئے۔ زخمیوں اور بے گھروں کی تعداد تو بے اندازہ ہے۔ اسرائیل نے جس بے رحمی سے فلسطینیوں اور عام مسلمان شہریوں، بلکہ عورتوں اور معصوم بچوں تک کو ایک ایک کر کے بھونا ہے اُس سے قساوت کا نیا ریکارڈ تاریخ میں قائم ہوا ہے۔ اس ظلمِ بے پایاں کا حساب اسرائیل اور موجودہ عالمی سیاست و تہذیب کے خداوندوں کو دینا ہو گا۔

لیا جائے تو معاملہ مصر کا ہو یا کشمیر کا، افغانستان کا ہو یا فلسطین کا، ہمیشہ نقصان دُنیائے اسلام کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح جب کسی معاملہ میں یہ دونوں قوتیں مشترک مفاد کے تحت متحد ہو جاتی ہیں تو بھی معاملات مسلمانوں کے خلاف جاتے ہیں۔

آج اگرچہ اہلِ افغانستان کے ساتھ ساتھ اہلِ فلسطین کا مسئلہ اُبھر کر سامنے آگیا ہے، مگر ہماری مصیبت کسی ایک مسئلے تک محدود نہیں ہے۔ ہمیں تو سرزمینِ کابل میں، اریٹریا میں، صومالیہ میں، مختصر یہ کہ جنوبی فلپائن میں اور بیروت میں مصائب کی ایک ایسی آتشیں زنجیر سے سابقہ ہے جس کا ایک سرا امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا روس کے ہاتھ میں۔ یہ دونوں طاقتیں آسیائے ظلم کے ایسے دو پاٹ ہیں کہ جن کے درمیان مسلمان پِس رہے ہیں۔

پس اب جہاں ایک گونہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اہلِ افغانستان اور اہلِ فلسطین کو جو بھی مدد دی جاسکتی ہو، وہ دی جائے، وہاں بھرپور توجہ اس مسئلے پر دینی چاہیے کہ ہم سُپر پاورز کی بنائی ہوئی چکی میں مسلسل پستے رہنے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

اور یہی اِس وقت موضوعِ گفتگو ہے۔

اصل بات کا مثبت طور پر آغاز کرنے سے پہلے ایک ضروری انتباہ!

نہایت ہی عجیب صورتِ حال ہے کہ اس مُلک کے وہ سیاسی کارکن اور ادیب و دانشور جو افغانستان کے مسلمانوں کی مظلومیت کا احساس نہ کرنے میں چٹانوں کی طرح سخت تھے، جن کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں ابھی صورتِ حالات پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی' اور جن کا عذر یہ بھی ہوتا تھا کہ یہ سیاسی جھگڑے ہیں، ان سے ہمارا کیا واسطہ۔ وہ لبنان میں اسرائیلی جارحیت پر اُچھل کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں اہلِ فلسطین کی تباہی کا کوئی غم نہیں، انہیں یہ خوشی ہے کہ ایک دورِ خلا کے بعد ایک موضوع مل گیا ہے۔ جیسے قحط زدہ بستی پہ بارش برس جائے۔ اُن کی دلچسپی اس وجہ سے ہے

کہ اہلِ فلسطین (چھاپہ ماروں) میں کمیونسٹوں کا کیا ہوا برسوں کا کام اُن کے سامنے ہے، جارج حبش اور جنبلاط جیسے لیڈر اُن کے "چوہدری" ہیں۔ لبنان میں فلسطینیوں کی آواز بلند کرنے کے لیے جو پبلسٹی مشینری کام کر رہی تھی اُس کے تحت افریشیائی تنظیم کا ایک رسالہ لوٹس (LOTUS) بھی نکلتا تھا جس کی ادارت کے لیے پاکستان سازش کیس کے نامور ہیرو جناب فیض احمد فیض کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ فیض صاحب فلسطینیوں کے سینے کمیونزم کے تیزاب سے دھوتے بھی تھے، مگر جب آزمائش کا لمحہ آیا تو وہ بیروت سے ماسکو جا پہنچے۔ اُدھر سے فلسطینیوں کی منافقانہ سرپرستی روس کی طرف سے ہو رہی تھی۔ منافقانہ اس لیے کہ آج فلسطینیوں کو بچانے کے لیے روس ضرورت سے دسواں حصہ کم پارٹ بھی ادا نہیں کر رہا۔ وہ تو شروع سے اسرائیل کے استحکام میں امریکہ کا حصہ دار ہے۔ ظاہر میں مخالفتِ امریکہ و اسرائیل ہوتی رہتی ہے، مگر اندر اندر اسرائیل کے لیے روس میں تیار شدہ سپاہیوں اور دانشوروں کا ایک ریلا برسوں سے چلا آرہا ہے، نیز مسلمان ملکوں کی امداد اس طرح کی جاتی ہے کہ اثر اُلٹا ہو۔

روس کے لیے تو حادثۂ لبنان سرمایۂ عیش و مسرت ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے افغانستان میں اس کے جرمِ جارحیت کا پلڑا امریکہ و اسرائیل کے برابر ہو گیا ہے، بلکہ بڑے پیمانے کے اس تازہ سنگین حادثے کے غبار میں اس کی جارحیت کی کارروائی قدرے چھپ گئی ہے۔ اصل صورتِ حالات یہ ہے کہ دونوں سپر پاورز میں بات یوں طے پا گئی ہے کہ لبنان میں امریکہ و اسرائیل جو چاہیں کر گزریں، روس تھوڑی بہت بیان بازی کے علاوہ کچھ نہیں کرے گا، اور دوسری طرف امریکہ کو اب حساب برابر کرنے کے لیے یہ ماننا پڑا ہے کہ افغانستان میں روس کو جو کچھ کرنا ہو وہ کرتا رہے، کوئی ٹھوس رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی (اور نہ پہلے کوئی تھی!) گویا معاملہ یوں پٹ ہوا کہ "لبنان تمہارا، افغانستان ہمارا"۔

بہرحال اب روسی "لائن" چونکہ یہ ہے کہ اہلِ فلسطین کی حمایت اور اسرائیل کی مخالفت میں پروپیگنڈے کا پورا زور صرف کر دیا جائے تاکہ مسئلہ افغانستان سے دنیا کی اور خصوصاً مسلمانوں کی توجہ ہٹ سکے، اس وجہ سے باہر کے کمیونسٹوں کی طرح ہمارے یہاں کے کمیونسٹوں اور اُن کے حامی دانشوروں اور صحافیوں اور سیاسی کارکنوں نے میدان میں

اپنی پسندیدہ "پالیسی" کی گیند لڑھکا دی ہے۔ خصوصاً پیپلز پارٹی کے منقار زیر پر پروردگان اور ایم آر ڈی کے سربراہان فلسطین کے درد میں تڑپ رہے ہیں۔ زور ان کا یہ ہے کہ ہمیں اور ہمارے کارکنوں کو لبنان بھجوایا جائے۔ چندہ بھی ہو رہا ہے، خون بھی اکٹھا ہونے لگ گیا ہے، ادیبوں سے دستخط بھی لیے جا رہے ہیں۔

مگر ان ظالموں کو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں، انسانیت سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ آپ سے اہلِ فلسطین کی حمایت یا اسرائیل کی مخالفت میں دستخط لینے یا کچھ کہلوانے کے لیے آئیں تو آپ ان سے پوچھیں کہ آخر مظلوم اہلِ افغانستان کی حمایت اور روس کی مخالفت میں تین برس سے آپ لوگ کیوں گونگے بنے ہوئے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جائیں گے۔

بیک وقت دو متضاد پالیسیوں کو اکٹھا کرنا کسی بھی نظریاتی گروہ کے لیے تباہ کن ہوتا ہے مگر سُرخ انقلابی دانشوروں نے دو مسلمان قوموں کے متعلق متضاد پالیسیوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں "بے اُصولی"۔

ان کا سارا زور یہ ہے کہ افغانستان کے مسئلے کو فلسطین کے مسئلے سے بالکل الگ کر لیا جائے، مگر میں خدا پرستوں اور حق پرستوں کو ان کے ٹیڑھے طرزِ فکر سے آگاہ کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تمام تحریروں، تقریروں اور گفتگوؤں میں دونوں مسئلوں کو اکٹھا لیجیے اور دونوں سپر پاورز کو اکٹھا رگید دیجیے۔ یہ آپ سے تائید حاصل کرنا چاہیں ..... تو مطالبہ کیجیے کہ ہماری پڑوسی اور برادر افغانستانی قوم کی مظلومیت پر بے حسی نہ دکھائی جائے اور دونوں طرف کی جارح قوتوں اور اُن کے پشتیبانوں کی مذمت کی جائے۔

جملۂ معترضہ پورا ہوا۔

آج حیرت ناک مسئلہ یہ ہے کہ لبنان میں اتنا بڑا سانحہ گذر گیا، مگر عالمِ اسلام میں اِس سرے سے اُس سرے تک سناٹا طاری ہے۔ کوئی زوردار آواز نہیں اُٹھی، کہیں بڑے احتجاجی مظاہرے نہیں ہوئے، کہیں جلوس نہیں نکلے، کہیں ہڑتالیں نہیں ہوئیں[1] یوں معلوم ہوتا ہے

[1] عبرت ناک واقعہ ہے کہ حالیہ اسرائیلی جارحیت کے خلاف زیادہ سے زیادہ (باقی برصفحہ آئندہ)

جیسے ایک ارب آبادی اپنی چالیس پینتالیس سلطنتوں کے باوجود سُن ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے پیارے مسلمانانِ گرامی قدر نے اسلام کو چھوڑ کر لادینیت، قومیت، وطنیت اور سوشلزم کے نظریے اپنا رکھے تھے۔ بعض ایسے ممالک ہیں جہاں برائے زینت دستور میں اسلام کا ذکر ہے یا معاشرے میں چند رسوم و تقاریب اسلامی نوعیت کی بھی جاری ہیں۔ وہاں بھی برسر اقتدار گروہ یا کم سے کم ذہین طبقوں اور اُن کی لیڈرشپ نے مغرب پرستی یا اشتراکیت پسندی کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ حتیٰ کہ آج لبنان میں چھاپہ مار فلسطینیوں کی جو آبادی موجود تھی اس کی اکثریت دین سے بیگانہ ہو کر رُدس کو پیرمان چکی ہے۔ اِسی وجہ سے یاسر عرفات جو متعدد بار ماسکو کا طواف کر چکے ہیں، آج ان کے اِس قول میں حسرتِ ناکام کا رنگ جھلکتا ہے کہ کاش کہ رُدس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

پُرزور احتجاج خود یہودیوں ہی نے کیا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں بھی اور خود اسرائیل میں بھی۔ اس قوم کے حساس نوجوانوں نے اسرائیلی فوج کے ساتھ لبنان کی بہیمانہ کارروائی میں شرکت سے انکار کر دیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

لہ ستم یہ کہ لبنان کے عیسائیوں (فلانجیوں) کی روش نے اس تجربہ قومیت کو اور بھی تلخ بنا دیا۔ پہلے تو لبنانی مسلمانوں کو مقامِ اکثریت سے گرانے کے لیے فلانجیوں نے لمبا دورِ خانہ جنگی گذارا اور خوب تباہی مچا کر ثابت کر دیا کہ عیسائی اور مسلمان ایک وطنی قوم نہیں بن سکتے۔ اِن حالات میں بھی فلسطینی چھاپہ ماروں اور پناہ گزینوں کا لبنانی عیسائیوں سے بڑا یارانہ تھا۔ مگر جب اسرائیلی فوج داخل ہوئی تو عیسائیوں نے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا، تب فلسطینیوں کی آنکھیں کھلیں۔ دراصل امریکی اسرائیلی منصوبہ یہ ہے کہ یہودی ریاست کے پہلو میں ایک عیسائی ریاست بھی قائم ہو جائے تاکہ مغرب کا مسلم دشمن محاذ مشرقِ وسطیٰ میں مضبوط ہو جائے اور مسلمان حکومتوں اور قوموں کو دبانے کے لیے یہ دونوں "اڈے" استعمال ہوں۔ اِس حکمتِ عملی کے معنی یہ بھی ہیں کہ یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کریں۔

کچھ تو کیا ہوتا[1]

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج تمام کے تمام غیر اسلامی نظریات مسلم اقوام و افراد کے پاس ایسے بے معنی ہو گئے ہیں، جیسے کسی نے پستول تو لگا رکھا ہو مگر اس میں کوئی گولی موجود نہ ہو۔ آج کوئی نظریہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے سامنے کوئی راہ عمل کھولتا ہو یا جس کی وجہ سے دنیا کی کوئی قوت ان کی سرپرستی یا حمایت پر تیار ہو۔

جتنا نظریاتی سوت ہماری قوموں اور خصوصاً فلسطینیوں نے کاتا تھا وہ جھیر جھیر ہوا پڑا ہے۔ عبرت کا ایک بہت بڑا سبق شام سے ملتا ہے۔ شام جو اتنا بڑھ بڑھ کے آگے آتا رہا ہے اور روسی پشت پناہی پر اعتماد کر کے لبنان میں مداخلت کیے ہوئے تھا۔ اس کا یہ حشر ہوا کہ پچھلی بار وہ جولان کی پہاڑیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا، اور اس دفعہ وہ فلسطینیوں کی مدد تو کیا کرتا الٹا اپنے ہی روسی اسلحہ اور اپنی ہی سپاہ کو تباہ کرا لیا۔ آخر جس ملک کا حال یہ ہو کہ ابھی چند ماہ پہلے وہ اندرونِ ملک دس ہزار افراد کو جبر و تشدد سے ختم کر چکا ہو اور بیس ہزار افراد کو جیل میں ڈالے ہوئے ہو، اُسے

[1] روسی حلقۂ اثر کی قوتوں نے یہ پروپیگنڈا پھیلا کر عربوں اور فلسطینیوں پر جادو کر رکھا تھا — کہ سوویٹ یونین ہی وہ واحد قوت ہے جو مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے حلقوں میں سامراجی عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں تک کہ عرب ملکوں اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے کچھ لیڈروں نے چند ہی مہینے پیشتر اپنے ایک اجلاس میں پورے جوش خوش فہمی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اور اسرائیلی عزائم کو ناکام بنانے کے لیے سوویٹ یونین کے حلقۂ اثر و نفوذ کو وسیع تر کرنے کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔ ان فریب خوردہ عناصر کے دماغ روسی پروپیگنڈے میں اس طرح جکڑے گئے تھے کہ یہ لوگ افغانستان کے مجاہدین کے لیے ہمدردی کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لا سکے محض اس خیال سے کہ اس طرح روس کی جارحانہ پالیسی کی مخالفت کا جرم سرزد ہو جائے گا۔ اور پھر وہ ہمارا نجات دہندہ نہ بن سکے گا۔ اب دیکھ لیجیے نجات دہندہ صاحب کا پارٹ۔ اب کہتے ہیں کہ عالمِ اسلام کیوں حرکت میں نہیں آتا۔ اسلام یا عالمِ اسلام کو کبھی آپ لوگوں نے وقعت بھی دی؟ ملّی جذبے کو کبھی متحرک بھی کیا؟

اندرونی محاذ رخصت ہی کب دیتا ہے کہ وہ باہر کوئی مردانگی دکھا سکے۔

سنائے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ برسوں کی محنتیں کھپا دی گئیں کہ اسلامی قومیت کے تصورات کو ذہنوں سے نکال کر علاقائی، لسانی یا وطنی قومیتیں پیدا کی جائیں۔ اور اُن کے لیے جذبات اُبھارے جائیں۔ قومیت کے اسی علاقائی و نسلی تصور پر چھاپہ مار فلسطینیوں اور ان کے عوام کو اُٹھایا گیا۔ یہ رشتہ تو کمزور ہو گیا کہ فلسطین پر مصیبت آئے تو ترکی یا مصر والے دوڑ پڑیں، اب تو ہر قوم کا اپنا اپنا محدود جذبۂ اجتماعیت ہے۔

آج مسلمانوں کو یہ تلخ تجربہ بھی درپیش ہے کہ مغربی فلسفۂ سیاست و اجتماع کا پیدا کردہ نیا تصورِ قومیت اُن کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا۔

محدود قومیتوں کے ضبط کی وجہ سے اتحادِ اسلامی کو بیدار کرنے کے لیے ..... کما حقہ توجہ نہ دی جا سکی۔ کانفرنسیں اور اجتماعات ضرور ہوتے رہے مگر بغیر کسی ایسے مؤثر منصوبے کے جو پوری ملّتِ اسلامیہ کو ایک کر سکے۔ آج اگر اس نہج پر کام ہوا ہوتا تو مصر دوسری عرب اقوام سے الگ نہ ہوتا۔ شام اور عراق میں اختلافات نہ ہوتے، ایران اور عراق کے درمیان ایسے نازک مرحلے میں جنگ نہ ہوتی۔ اور اگر چھڑ گئی تھی تو افہام و تفہیم سے بند کرا دی جا سکتی۔

اس اتحاد میں رکاوٹ یہ امر بھی ہے کہ مختلف بادشاہتیں اور آمریتیں اور نیم جمہوریتیں جس طبقے کے چلائے چل رہی ہیں اُن میں سے ہر ایک کو عالمِ اسلام کیا، خود اپنی قوم سے بھی اپنا مفاد زیادہ عزیز ہے۔ اس کے لیے کسی نے رُوس کی دوستی و سرپرستی حاصل کر رکھی ہے اور کسی نے مغرب پسند بن کر امریکہ کو اپنا پشتیبان بنا رکھا ہے۔

اب جب کہ عملاً رُوس اور امریکہ دونوں قوتیں میدان میں مسلمانوں کے خلاف کام کر رہی ہیں اُن میں سے کوئی بھی نہیں جو مسلمانوں کے حقوق اور اُن کے مسائل کا لحاظ کرے (باقی برصفحہ ۵۰)

(بقیہ اشارات) اور اُن کو اپنی حمایت مہیا کرے یا اُن کی خاطر کسی دوسری قوت سے معاملات کو خراب کرے۔ یوں جب برسوں میں محنت سے قائم کی ہوئی دوستیاں وقت آنے پر بے کار ثابت ہوں تو ایک دفعہ تو ذہنوں میں بر فباری ہو جاتی ہے۔ سو ہمارے عالمِ اسلام میں یہ ذہنی برف باری بھی خوب ہو رہی ہے۔

ایک مسئلہ اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ مسلمان ملکوں نے اور تو سب کچھ کیا، مگر جنگی قوت پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کی ضرورت تھی۔ کھانوں اور لباس کی بہار، آسائشوں کا وفور، عیاشی کا زور، ثقافتی مشغلوں کی ترویج، شاندار عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے لیے روپیہ لنڈھایا جا رہا ہے، مگر کسی کے پاس بھی ایسی دفاعی قوت نہیں ہے کہ بُرا وقت پڑنے پر وہ میدان میں کود جائے۔ آج کسی میں سکت نہیں کہ اسرائیل کا فوجی مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اگر یہی حال رہا تو اسرائیل اپنے دیرینہ منصوبے کے مطابق ایک ایک کر کے سب کو نگل لے گا۔

پھر ایک پہلو ہر ہر ملک کی دفاعی قوت کا ہے اور دوسرا پہلو مشترک دفاعی قوت کا۔ مشترک دفاعی قوت کی تاسیس تو کجا، ابھی اس موضوع پر کسی نے سوچا ہی نہیں۔

آج ہم اپنی پچھلی کوتاہی (بلکہ کوتاہیوں) کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اور اگر اب بھی اس کوتاہی کی تلافی نہ کریں گے تو آئندہ مزید سزائیں بھگتیں گے۔

پس میں چاہتا ہوں کہ آج ہم اس مسئلے پر بھی غور کریں۔

سنٹا ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ سربراہوں کی اسلامی کانفرنس کا جلد سے جلد انعقاد عمل میں لایا جائے اور اس کے لیے سلسلہ جنبانی ہو چکی ہے۔ اس کانفرنس میں حسبِ ذیل اُمور طے ہو جانے چاہئیں:-

۱۔ تمام مسلم حکومتیں یہ طے کر لیں کہ آئندہ وہ اسلامی نظریہ و نظام کو یکسوئی کے ساتھ اپنا محورِ نظر قرار دیں گی۔ اسے اپنے عوام میں فروغ دیں گی اور اس کے مطابق سیاسی، تعلیمی، معاشی

اور عدالتی نظام کو درست کرنے کی سعی کریں گی۔ تمام مخالفِ اسلام نظریات کا وہ سختی سے سدِباب کریں گی۔ خصوصاً سیکولرازم اور نیشنلزم اور سوشلزم کے نعروں کا طلسم توڑ دیں گی۔ آخرکار اسلام ہی ہمارے لیے مستحکم بنائے اتحاد ثابت ہوگا۔

۲ — تمام مسلم حکومتیں اور اقوام مجلسِ اقوامِ متحدہ سے انقطاع کر لیں، کیونکہ یہ بڑی طاقتوں کی آلۂ کار ہے اور بڑی طاقتیں اپنا اعتماد کھو چکی ہیں۔ یہ بھرپور احتجاج بھی ہوگا اور اظہارِ ندامت بھی، اور اس دروازے سے اُمیدوں کو منقطع کر لینے سے اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی ہمت بھی بڑھے گی۔ اس اقدام کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی بین الاسلامی تنظیم بنا لینی چاہیے۔

۳ — یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ تیل کی فروخت نہ امریکہ کو کی جائے گی نہ کسی ایسے ملک کو جہاں سے وہ امریکہ یا اسرائیل کو حاصل ہو سکے۔

۴ — یہ بھی فیصلہ کر لیا جائے کہ تمام سرمایہ امریکہ اور ایسے ملکوں کے بینکوں سے نکلوا لیے جائیں جہاں سے وہ پھر امریکہ کو پہنچ جاتے ہوں۔

۵ — تمام امریکی فرموں اور منصوبوں کو مسلم ممالک میں بند کر دیا جائے اور اُن کے ماہرین واپس کر دیے جائیں۔

۶ — اپنی منڈیاں امریکہ اور اسرائیل نواز ملکوں کے لیے بند کر دی جائیں۔ کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی۔[1]

۷ — مشترکہ دفاع کا ایک وسیع ۵ یا ۱۰ سالہ منصوبہ بنایا جائے اور اس کے تحت حسبِ ذیل اقدامات کیے جائیں۔

ا — بہت بڑے مشترکہ دفاعی فنڈ کا قیام۔

---

[1] ان سارے اقدامات کو عمل میں لانے سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ ایک سپر پاور کے خلاف کو پُر کرنے کے لیے دوسری کو خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے سمجھ کر یہ طے کر لیا جائے گا کہ ہمیں اب اپنے پیروں پہ بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہونا ہے۔

ب - آزاد منڈی سے بہترین اسلحہ کی خریداری اور اسلحہ سازی کے لیے مشینری، ٹیکنالوجی اور کاریگروں کا حصول۔

ج - مختلف ممالک میں محفوظ مقامات پر اسلحہ سازی کے کارخانے پھیلا دیے جائیں۔

د - عالمِ اسلام کی ایک ملّی فوج تیار کرنے کے لیے ہر ملک میں ایسے ایک ایک دو دو ڈویژن تیار کیے جائیں، جن میں بری، بحری اور فضائی دستے مع ساز و سامان شامل ہوں۔

س - تین تین چار چار ممالک کی ملّی فوج کے منتخب دستے (باری باری) ششماہی میں کسی ایک جگہ جمع ہو کر مشترک فوجی مشقیں کریں۔

۸ — کوئی دفاعی نظام اپنے بہترین نظام اطلاعات و خبریات کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا، نیز اسے اپنی مضبوط پروپیگنڈا مشینری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے نظام اور مشینری کے قیام کا فیصلہ ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا تفصیلی پروگرام بنا کر جلد سے جلد اس پر عمل شروع کر دینا چاہیے۔

تھوڑے سے فرق کے ساتھ بنیادی طور پر یہ وہی پروگرام ہے جسے قائدِ تحریکِ اسلامی میاں طفیل محمد نے پیش کیا ہے۔

اگر اس طرح کی انقلابی حرکت عالمِ اسلام کے علماء اور رہنما اور حکمران پیدا کر سکتے ہیں، پھر تو نئی تقدیر کا ظہور ممکن ہے — نہیں تو آج جو کچھ درپیش ہے، کل اس سے بڑھ کر ذلیل کن واقعات ہو سکتے ہیں۔

اب زندہ رہنے کے لیے اتحاد ناگزیر ہے اور جہاد ناگزیر ہے — اور اتحاد اور جہاد کے لیے اسلام ناگزیر ہے!

---

(۲)

عالمِ بالا کی بساط کے مہروں کی نقل و حرکت کے متعلق ہم براہ راست تو کچھ نہیں جان سکتے، بس ہوا کے جھونکے ہی کچھ غمازی کر دیتے ہیں۔ مگر اس غمازی کی بنا پر کوئی ٹھوس بات تو نہیں کہی جا سکتی۔

اب مثلاً جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب اسلامی نظریاتی کونسل کی صدارت سے الگ ہوئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں الگ ہوئے؟ ان کا کوئی قصور تھا؟ قصور ہی قصور تھا یا کوئی خدمات بھی تھیں؟ پھر کیا قصور کا پلڑا زیادہ بھاری ہو گا؟ یا کیا وہ کارپردازوں کو خوش نہ رکھ سکے؟

ہم عامیوں کی دانست میں وہ ملک کے ایک ایسے فاضل آدمی تھے جو مروجہ قانون سے بھی براہِ راست واقفیت رکھتے تھے اور قانونِ شریعت کے دائرے میں بھی ان کے مطالعہ و تحقیق کے بصیرت افروز نتائج و ثمرات سامنے موجود ہیں۔ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ شخصیت کے مالک تھے اور ہر قسم کی گروہ بندیوں سے منقطع۔ ان کے متعلق خواص کے حلقوں سے گواہی مل سکتی ہے کہ وہ صاحبِ دیانت و امانت اور محنتی آدمی تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کا بدل آسانی سے نہیں ملے گا۔

ایسے آدمی کے الگ ہونے پر اور نہیں تو کم سے کم اس کا کیا ہوا کام قوم کے سامنے ضرور آنا چاہیئے تھا۔ جن قوانین کی انہوں نے تدوین کی اور کرائی یا کسی نامکمل مسودے کی تکمیل ان کے دور میں ہوئی ایسے تمام کاموں کی رپورٹ سامنے آنی چاہیئے تھی۔ خاص طور پر حال ہی میں ملک کے آئندہ سیاسی نظام کے متعلق انہوں نے وسیع پیمانے پر اہلِ علم کے مشورے حاصل کر کے جو خاکہ تیار کیا تھا وہ تو لازماً شائع ہونا چاہیئے تھا تاکہ لوگ اس پر مزید غور و بحث کرتے۔ اس خاکے کے متعلق جب یہ کہا گیا کہ اس میں عملی اقدامات تجویز نہیں کئے گئے تو اس قول کے بعد یہ ضرورت اور بھی بڑھ گئی کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر جو سیاسی ڈھانچہ تجویز کیا گیا تھا۔ وہ ملک کے تمام سوچنے سمجھنے والوں کے سامنے آجائے۔

یہ روایت کچھ اچھی نہیں کہ اندر ہی اندر کسی موضوع پر اسلامی نظریاتی کونسل میں بھی کام ہو، کسی وزارتی کمیٹی میں بھی اور پھر جس کام کو حکومت چاہے پسند کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے بغیر اس کے کہ قوم کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ کدھر سے کیا پیش کیا گیا۔ لوگ خود اندازہ کر سکتے ہیں

کہ کدھر کیا نقص ہے۔ یا خوبیاں ہیں تو کیا ہیں۔

معلوم نہیں، قومی خرچ سے چلنے والے بڑے بڑے قومی اداروں، خصوصاً اسلامی نظریاتی کونسل جیسے ایوانوں کا کام اخفا میں کیوں رکھا جاتا ہے۔

ایک افواہ یہ ہے کہ جس گروہ نے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو نکلوایا ہے، اس نے ان کے قلم سے تدوین قانون اسلامی کے سلسلے میں شائع شدہ مجموعہ قوانین اسلام پر یہ اعتراض اٹھایا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع شدہ ایک کتاب کا چربہ ہے۔ اس سے پہلے لاہور کے محکمہ اوقاف کی شائع کردہ علمی کتاب تاریخ تصوف کے متعلق بھی واویلا کیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ لاہور والے معاملے میں بھی اور خاص طور پر ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کی درجۂ اول کی شخصیت کے بارے میں اشتعلہ سامنے آنے پر (اگر اسے اہمیت دینا ضروری تھا تو) دیانت دار اہل علم کا ایک بورڈ بٹھایا جاتا اور وہ باقاعدہ مطالعہ و تحقیق کر کے اور جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب کی وضاحتوں کو سامنے رکھ کر ایک واضح اور قطعی فیصلہ دیتا، کارتوس چھوڑنے والوں کا کارتوس چل گیا اور نشانے پر لگا۔ سچ ہے۔ ع

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

ہم درخواست کرتے ہیں کہ اب "بعد از خرابیٔ احوال" بھی اس معاملے کی ٹھوس تحقیق کرائی جائے ورنہ چغلی کی کرامات ہمارے ہاں بڑھتی جائیں گی۔ مجھے تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کل ہمارے بزرگوں میں سے کوئی اٹھ کر یہ نہ کہہ دے کہ ایڈیٹر ترجمان القرآن اپنا پرچہ خود تیار نہیں کرتا بلکہ ہانگ کانگ یا سکنڈے نیویا یا نیوگنی کے کسی پرچے سے سب کچھ نقل کر لیتا ہے۔

آخر اہل تنقید کی صفیں اس کام کے لئے موجود ہیں کہ وہ علمی یا ادبی کتابوں کی ہر کمزوری پر گرفت کریں، کہیں سرقہ کا اثر پائیں تو اس کی نشاندہی کریں۔ آخر یہ حق کسی مذہبی گروہ کے واعظ کیوں زبردستی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مصنفین کی کتابوں کے خلاف جو چاہیں آواز اٹھائیں اور پھر بغیر کسی ٹھوس انکوائری کے انہی کی آواز کو خدا کی لاٹھی بنا دیا جائے۔ یہ روش اگر مختلف مذہبی گروہ اختیار کر لیں تو میرا خیال ہے کہ اس ملک میں کوئی صاحب علم و تحقیق

بچا نہ رہ جائے گا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے صدروں کے ادل بدل کے سلسلے کو دیکھ کر یہ اندیشہ بھی لوگ محسوس کر سکتے ہیں کہ پرانے تاخیری حربے چونکہ بدنام ہو گئے ہیں، لہٰذا اب ایک نیا تاخیری حربہ ایجاد کیا گیا ہے کہ نظریاتی کونسل کچھ عرصے تک کام کرے، پھر اس کے صدر کو بدل دیا جائے۔ نیا صدر پچھلے کام کے خطوط سے کسی قدر مختلف انداز میں کام کو آگے بڑھا چکے تو پھر اسے بھی ہٹا دیا جائے اس طرح دسیوں سال تجربے کئے جا سکتے ہیں۔

کیا یہ بھی "اسلام بادلِ ناخواستہ" کے مریض، بعض بیوروکریٹس کا کھیل تو نہیں ہے۔ جب کھیل گرم ہو تو یہ لوگ ریفری بن کر یا ریفری سے کہہ کر کپتان کو آؤٹ کرا دیں۔ پھر نئے سرے سے کھیل شروع ہو اور پھر دوسرے کپتان کو آؤٹ کرا دیا جائے۔

اس پہلو سے نہ صرف اچھی طرح تحقیق ہونی چاہیئے اور پہلے دورِ صدارت اور دوسرے دورِ صدارت میں ہونے والے کام کی رپورٹ بھی سامنے لائی جائے اور جو مسودہ ہائے قانون تیار ہوئے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ برائے استصواب شائع کر دیا جائے۔

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آنے والے تیسرے صدر کو خیال رکھنا ہوگا کہ وہ کام کی مقدار اور اس کے معیار کو سابق سے نہ گرنے دے۔

ہمارا خیال ہے کہ کسی نہ کسی طرح عوام کو یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو افسر شاہی نے اپنا ٹینس کورٹ تو نہیں بنا لیا۔ صدران کے لئے محض گیند ہو اور ارکان تماشائی۔

نوٹ

یہ سطور کتابت ہو کر طباعت کے لیے جا رہی تھیں کہ یہ خوش آئند اطلاع ملی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ہونے والے اجلاس کی صدارت جسٹس تنزیل الرحمٰن

ہی کریں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں تاحال الگ نہیں کیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ ان کی خدمات کا سلسلہ مستقلاً جاری رہے۔ ساتھ ہی ایک واقعہ یہ ہوا کہ اگرچہ نظامِ حکومت کے متعلق کونسل کی رپورٹ سرکاری طور پر شائع نہیں ہوئی، مگر کسی نہ کسی طرح اس کی تلخیص پریس میں آگئی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حکومت پوری رپورٹ کو اشاعت میں لے آئے۔ ان نو پدید حقائق کا ذکر کر دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔

(بقیہ مطبوعات)

کو نہیں کہتے کہ اپنی مرضی اور پسند کے افراد جمع کر لیے جائیں اور اختلاف کی جرأت کرنے والوں کو چھوڑ دیا جائے اور پھر اہلِ شوریٰ سے کسی بھی فیصلے پر انگوٹھا لگوا لیا جائے۔ یا اُن کی باتوں میں سے جو بات اپنے مطلب کی ہو وہ لے لی جائے۔ اور بقیہ سب کچھ چھوڑ دیا جائے۔ اس غلط تصورِ شوریٰ کو لے کر چلیں گے تو طرح طرح کے اشکال پیدا ہوتے رہیں گے۔ صحیح تصورِ شوریٰ یہ ہے کہ ایسے اہلِ نظر اور اصحابِ وجوہ جنہیں معاشرے میں وقار و اعتماد حاصل ہو مجلسِ شوریٰ میں شامل ہونے چاہئیں اور اُن کی آراء اور بحثوں کے ماحصل پر فیصلے مبنی ہونے چاہئیں۔

مجھے بھی موکف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ شاید کوئی اسلام دشمن تحریک مسلمانوں میں اس طرح کے خوفناک جھگڑوں کو پھیلا کر اُن میں اپنے مفاد کے لیے تصادم کی نئی رَو شروع کرانا چاہتی ہو۔ افسوسناک اطلاع وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ جھگڑے اب دینی مدارس تک بھی جا پہنچے ہیں۔

رسالہ دینی مزاج کے اصحاب کے لیے زیادہ مفید ہے، مگر عام نوجوانوں کی افہام و تفہیم کے لیے تجزیۂ مسائل اور اندازِ بیان ذرا مختلف طرز کا ہونا چاہیے۔